کوثر نیازی

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری

گاؤں میں جب سے شعور نے آنکھیں کھولیں سرخ وردیوں اور کلہاڑیوں کو دیکھنا شروع کیا' یہ احراری حضرات کا مخصوص لباس تھا' پہلی جماعت میں ہمارے استاد صوفی عبدالرحیم صاحب مسکین تھے جو اس وقت ضلعی مجلسِ احرار کے صدر اور آج کل کل پاکستان مجلس احرار اسلام کے صدر ہیں' ان کی زبان سے پہلی بار سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری رحمتہ اللہ علیہ کا ذکر سنا' صوفی مسکین کا شمار گاؤں کے سربر آوردہ لوگوں میں ہوتا تھا' تقریر بھی اچھی خاصی کرتے تھے' پنجابی اور اردو کے شاعر بھی تھے' انہوں نے اپنے اردگرد گاؤں کی اچھی خاصی جماعت جمع کر لی تھی' کبھی کبھی یہ لوگ سرخ وردیاں پہنے اور کلہاڑیاں کندھوں پر رکھے گاؤں کی گلیوں سے گذرتے تو لطف ہی آ جاتا۔ نہر کے کنارے درختوں کے نیچے ان کے جلسے منعقد ہوتے تو پورا گاؤں اُمنڈ آتا۔ کالاباغ کے مولانا گل شیر شہید ان جلسوں کے مقبول مقرر۔ دورانِ وعظ وہ بھی شاہ جی کا ذکر ضرور کرتے' اس طرح گویا بچپن ہی سے یہ نام حافظے پر مرتسم ہو کر گیا تھا۔

51ء میں مستقلاً لاہور آ گیا تو اس سے اگلے سال 52ء میں پہلی مرتبہ شاہ جی کی زیارت ہ باغ بیرون موچی دروازہ کی تاریخی جلسہ گاہ میں ایک عظیم اجتماع انہیں سننے کے لئے جمع تھا۔ میں بھی دیکھنے اور سننے کے لئے کشاں کشاں پہنچا' وہ منظر مجھے اب تک یاد ہے جب شاہ جی سٹیج پر تشریف ا سروقد' خوبصورت نقش و نگار' لمبے لمبے گیسو، بھرے بھرے پُر رعب چہرے پر گھنی ڈاڑھی' حج میں قرآن حکیم پڑھنا شروع کیا تو یوں لگا جیسے شجرو حجر جھوم اٹھے ہوں۔ بولے تو موتی رولے بے! ظفر علی خان کا شعر زبان پر آ گیا۔

کانوں میں گونجتے ہیں بخاری کے زمزمے
بلبل چہک رہا ہے ریاض رسولؐ میں

مجلسِ احرار 1929ء میں قائم ہوئی یہ شروع شروع میں صرف مجلسِ احرار پنجاب تھی' 1932ء میں آل انڈیا مرکزی مجلس احرار کا قیام عمل میں آیا۔ دونوں مرتبہ اس کے صدر مولانا حبیب الرحمان منتخب ہوئے مگر شاہ جی کا تعلق اس سے ویسا ہی تھا جیسے کانگریس سے گاندھی کا' شاہ جی اور احرار دونوں لازم وملزوم تھے۔ ایک نام سن کر دوسرا نام خود بخود ذہن میں آ جاتا تھا' سیاسی مسلک اس جماعت کا وہی تھا جو جمعیت علمائے ہند کا تھا۔ جمعیت کانگریس کا دینی محاذ تھی تو احرار مسلمانوں میں اس کا عوامی اور سیاسی

مورخ، احرار کے اکثر ارکان حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے عقیدت مند تھے اور بدیں وجہ سیاست میں بھی انہی کے مقلد تھے، اس لحاظ سے مجلس احرار اور شاہ جی دونوں تحریک پاکستان کے مخالف تھے مگر انگریز دشمنی اور تحریک آزادی کے لئے جو قربانیاں انہوں نے پیش کیں کوئی دیانت دار مورخ ان سے صرف نظر نہیں کر سکتا، تحریک پاکستان کی مخالفت زیادہ سے زیادہ ان لوگوں کی اجتہادی غلطی تھی، پاکستان بن گیا تو مجلس احرار سیاست سے علیحدہ ہو گئی اور دل و جان سے پاکستان کی حمایت اور محافظت کرنے لگی۔ 50ء میں بھارتی فوجیں پاکستانی سرحدات پر جمع ہوئیں اور لیاقت علی خان مرحوم نے پنڈت نہرو کو مشہور عالم مکا دکھایا تو شاہ جی بھی میدان عمل میں آ گئے۔ انہوں نے ملک کے طول و عرض کا دورہ کیا اور دفاع پاکستان کے موضوع پر یادگار جلسوں سے خطاب کیا۔

مجلس احرار نے برصغیر کی سیاست میں کوئی ٹھوس کامیابی حاصل نہیں کی مگر یہی کیا کم ہے کہ اس نے اردو زبان کے بعض ایسے قد آور اور نامور خطیبوں سے قوم کو روشناس کرایا جو حقیقی معنوں میں میدان خطابت کے شاہسوار تھے۔ جس طرح سیاست میں جماعت اسلامی کا اصل اثاثہ اس کا لٹریچر ہے اسی طرح احرار کی شہرت بھی اس کے بے مثال خطیبوں کی مرہون منت ہے۔ میں نے نہ صرف ان خطیبوں کی تقریریں سنی ہیں بلکہ مجھے یہ شرف حاصل ہے کہ ان میں سے اکثر کے ساتھ میں نے خود جلسہ ہائے عام سے خطاب کیا ہے۔ ہمارے ہاں کون ایسا ہو گا جس نے قاضی احسان احمد شجاع آبادی، ماسٹر تاج الدین انصاری، شیخ حسام الدین، صاحبزادہ فیض الحسن، مولانا مظہر علی اظہر، مولانا غلام غوث ہزاروی، مولانا محمد علی جالندھری اور آغا شورش کاشمیری کا نام نہ سنا ہو، یہ سب اسی آسمان خطابت کے چاند اور ستارے تھے ان تمام مقررین کی نمایاں خصوصیات ان کا جذباتی انداز بیاں، شعر و ادب کی چاشنی اور مذہب سے حد درجہ شیفتگی تھیں۔ ان کے مداحوں سے قطع نظر ان کے مخالفین بھی ان کے جلسوں میں ان کی تقریروں سے لطف اندوز ہونے کیلئے شوق سے جاتے تھے اور ان کے لطیفوں، چٹکلوں اور دلچسپ انداز بیاں کا دل سے اعتراف کرتے تھے۔
جس جماعت کے پاس اتنے بڑے بڑے عوامی خطیب ہوں اس کے اجتماعات کی کامیابی میں کیا شک و شبہ ہو سکتا ہے؟۔

مگر ان چاند تاروں نے کسب نور جس آفتاب سے کیا وہ شاہ جی ہی کی ذات تھی، یہ حقیقت ہے کہ بڑے بڑے جلسوں کو اپنی تقریر کے جادو سے مسحور کر دینے کے فن میں کوئی شخص شاہ جی کا ہم پلہ نہ تھا وہ رات کے نو دس بجے تقریر شروع کرتے تو صبح تک کئے جاتے اور سننے والے اس طرح جم کر بیٹھتے گویا تمام عمر تقریر ہوتی رہے تو تمام عمر یوں ہی بیٹھے رہیں گے، تقریر میں جذبات کی شدت پیدا کر کے لوگوں کو بے

اختیار رلا دینا' ایثار اور قربانی کے بیان سے انہیں اپنا سب کچھ قربان کرنے پر تیار کر دینا اور چٹکلوں اور لطیفوں سے روتی ہوئی محفل کو ہنسا دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

شاہ جی کو اگر زمانہ قدیم کے خطیبوں میں سے کسی کے ساتھ تشبیہ دی جا سکتی ہے تو وہ یونان کا "ڈیما ستھینز ہے جسے اس دور کے مورخین نے سب سے پہلا بڑا خطیب قرار دیا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ "ڈیما ستھینز نے شجاعت کے موضوع پر فقط داد خطابت دی ہے ولولہ انگیز تقریریں کیں ہیں اور وقت آنے پر میدان کارزار سے راہ فرار اختیار کرنے میں عافیت سمجھی ہے مگر شاہ جی نہ صرف کاروانِ شجاعت کے حدی خواں تھے بلکہ اس مقصد کے لئے انہوں نے ساری عمر مصائب اور آزمائشوں کا بھی مردانہ وار مقابلہ کیا۔ وہ خود فرماتے تھے "میری آدھی عمر ریل میں اور آدھی جیل میں کٹ گئی"۔

جماعت اسلامی والے عام طور پر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم نے خطابت میں ایک نیا انداز اور نیا اسلوب پیدا کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ بنیادی طور پر جماعت کا مکتب فکر خطیبانہ جوہر نہیں رکھتا۔ جس طرح مجلس احرار خطابت کیوجہ سے آگے بڑھی ہے اس جماعت کے اکابر اپنی تحریروں کی وجہ سے معروف ہیں ان کی تقریریں خشک تحریروں کی مانند ہوتی ہیں اور ان تقریروں میں وہ ایسی لق و دق اور نامانوس اصطلاحیں استعمال کرتے ہیں جو اکثر اوقات سامعین کے سر سے گزر جاتی ہیں البتہ حضرت مولانا امین احسن اصلاحی کی شخصیت اس جماعتی رنگ سے مستثنیٰ تھی (جو مولانا مودودی مرحوم کی غیر حاضری میں امیر جماعت ہوتے تھے مگر بعد میں جماعت سے اختلافات کی بنیاد پر مستعفی ہو گئے تھے) مولانا اصلاحی نہایت بلند پایہ خطیب ہیں اور ان کی تقریریں علم اور جذبے کا حسین آمیزہ ہوتی ہیں یا پھر مولانا گلزار احمد مظاہری ہیں جن کا وعظ و خطابت میں اپنا ایک رنگ ہے مگر یہ رنگ ان میں مجلس احرار کے سابقہ تعلق کے زیر اثر پیدا ہوا ہے اس میں جماعت کا کوئی عمل دخل نہیں۔

اس مکتب فکر کے ایک ممتاز ادیب اور شاعر جناب نعیم صدیقی ہیں جو جماعت کے دائرے میں ایک اعلیٰ پائے کے مقرر بھی شمار ہوتے ہیں اور اس میں شک نہیں وہ ایک اچھے لیکچرار ہیں 'اپنے موضوع پر خوب محنت کرتے اور اس کا حق ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر عوامی خطابت کے جوہر سے وہ بھی محروم ہیں ایک بار موصوف کے فن تقریر پر سید عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم نے نہایت عمدہ اور موزوں تبصرہ کیا تھا یہ ان دنوں کی بات ہے جب 53ء میں ہم لوگ لاہور سنٹرل جیل میں نظر بند تھے۔ ان ایام اسیری کے دوران کبھی کبھی مجلس شعر بھی آراستہ ہوتی تھی۔ایک ایسی ہی محفل میں جناب نعیم صدیقی کا تعارف ان سے کرایا گیا تو فرمانے لگے۔

"اچھا آپ ہیں نعیم صدیقی! خوب! کچھ تعارف تو آپ سے پہلے بھی ہے وہ اس طرح کہ ایک بار میں قاسم باغ کے قریب سے گزر رہا تھا وہاں کوئی جلسہ تھا جس میں ایک

تقریر جاری تھی مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے کوئی مشین بول رہی ہو پوچھنے پر پتہ چلا کہ مشین نہ تھی آپ تھے۔"

خطابت کا جادو جگانے کے لئے خطیب کو سحر آفریں شخصیت کا بھی حامل ہونا چاہئے۔ اس اعتبار سے بھی شاہ جی کا جواب نہ تھا۔ قدرت نے انہیں ایسا حسن اور مردانہ وجاہت عطا کی تھی کہ جو دیکھتا دیکھتا ہی رہ جاتا۔ کہتے ہیں ایک انگریز فلم ساز نے انہیں تقریر کرتے دیکھ کر کہا تھا کہ اگر مجھے اپنی فلم میں حضرت مسیح علیہ السلام کا کردار ادا کرنے کے لئے کسی شخص کو لینا ہو تو اس مقصد کے لئے اس شخص سے زیادہ موزوں کوئی نہ ہو گا۔

1892ء میں پٹنہ (بہار) میں پیدا ہوئے' بعد میں امرتسر آ گئے' یہیں دینی تعلیم حاصل کی' پاکستان بنا تو ملتان میں قیام پذیر ہوئے' 21/ اگست 1961ء کو جان جان آفرین کے سپرد کی' انہوں نے پوری عمر اور پوری عمر کی تمام تر توانائیاں ملک و ملت کی نذر کر دیں۔ کسی اور کو یاد ہو یا نہ ہو مگر۔

ہمیں ہے یاد سرگزشتِ زندگی نہال کی
ہوا تمام، حسنِ گلُ رخاں سے کھیلتا ہوا

پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ہم اور شاہ جی سنٹرل جیل لاہور میں اکٹھے ہو گئے' یہ 1953ء کی بات ہے جب تحریک ختمِ نبوتؐ کے سلسلے میں شاہ جی دوسرے احرار راہنماؤں کے ساتھ گرفتار کر لئے گئے تھے' میں ان دنوں جماعتِ اسلامی میں شامل اور اس کے آرگن "کوثر" لاہور کا ایڈیٹر تھا۔ اٹھارہ' انیس سال کی عمر تھی' جماعت نے اس تحریک میں باقاعدہ حصہ نہیں لیا تھا وہ اسے آئینی حدود میں رکھنا چاہتی تھی مگر مولانا مودودی اس موضوع پر ایک کتابچہ لکھنے کی وجہ سے گرفتار ہوئے تو ان کے ساتھ دوسرے جماعتی راہنماؤں کے علاوہ میں بھی پکڑا گیا۔ شاہ جی اور ان کے ساتھی سنٹرل جیل کے جس احاطے میں نظر بند تھے وہ دیوانی گھر کے نام سے مشہور تھا' ہم جس احاطے میں تھے اسے "بم کیس" کہتے تھے۔ یہ "بم کیس" نام اس احاطہ کا اس لئے پڑا تھا کیونکہ اس میں مشہور بم کیس میں ملوّث بھگت سنگھ اور اس کے ساتھی رہا کرتے تھے۔ بھگت سنگھ پر دہلی کے اسمبلی ہال میں بم پھینکنے کا مقدمہ چلا اس پر ایک انگریز پولیس کپتان کے قتل کا بھی الزام تھا۔ پھانسی کی سزا ہوئی تو بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں نے پھانسی کا پھندا خود اپنی گردن میں ڈالا اور نعرے لگاتے ہوئے موت کو لبیک کہا۔ "بہارستان" میں مولانا ظفر علی خان کی یہ نظم اسی زمانے کی یادگار ہے۔

شہیدانِ وطن کے خونِ ناحق کا جو ست نکلے
تو اس کے ذرّے ذرّے سے بھگت سنگھ اور دت نکلے

تو ہاں میں عرض کر رہا تھا کہ شاہ جی اپنے ساتھیوں کے ساتھ دیوانی گھر میں رہتے تھے اور ہم بم کیس میں، جیل حکام سے کہہ کر ہم نے یہ رعایت لے لی تھی کہ جمعہ کے جمعہ ہم لوگ آپس میں مل لیں۔ اس رعایت کے تحت ایک جمعہ ہم لوگ دیوانی گھر جاتے تو اگلے جمعہ شاہ جی اپنے رفقاء کے ساتھ بم کیس تشریف لے آتے اسی زمانے کا ایک لطیفہ اب تک یاد ہے، ہم لوگ والی بال کھیلا کرتے تھے دیوانی گھر ٹیم کے کپتان صاحبزادہ فیض الحسن تھے اور بم کیس ٹیم کا میں، شاہ جی بڑی دلچسپی سے کھیل دیکھتے، کبھی کبھی خود بھی شامل ہو کر سروس کیا کرتے تھے ایک بار مولانا امین احسن اصلاحی نے شاہ جی سے کہا:

"شاہ جی آپ سروس کرتے ہیں"۔

انہوں نے کہا "ہاں پوری زندگی سروس کرتے ہی گزار دی ہے"۔

مولانا اصلاحی برجستہ بولے "لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ یہ سروس اکثر فاؤل ہوتی ہے"۔

سنٹرل جیل کے اس زمانہ نظر بندی میں، میں نے خوب خوب شاعری کی، ایک تو میں شادی کے تیسرے ہی دن گرفتار ہوا تھا کچھ اس کا اثر اور کچھ "رگِ سنگ ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور" کے اصول کا نتیجہ، ہر روز ایک آدھ غزل ہو جاتی، میرے مجموعہ کلام "زرِ گل" کا بیشتر حصہ اسی عہد اسیری کی یادگار ہے۔ شاہ جی تشریف لاتے تو شعر و سخن کی محفل بھی جمتی۔ وہ شعر کا نہایت اعلیٰ ذوق رکھتے تھے خود شاعر تھے ندیم تخلص کرتے تھے۔ اردو، فارسی دونوں زبانوں میں بڑے خوبصورت شعر کہے ہیں، میرے اشعار سنتے اور بزرگانہ داد سے حوصلہ افزائی فرماتے، ایک مرتبہ میں نے غزل سنائی تو اس میں ایک شعر یہ بھی تھا۔

صیاد نے تیرے اسیروں کو آخر یہ کہہ کر چھوڑ دیا
یہ لوگ قفس میں رہ کر بھی گلشن کا نظارا کرتے ہیں

بے اختیار تڑپ گئے، بار بار شعر کی تکرار کرائی، کہنے لگے مجھے ایک تاریخی واقعہ یاد آ گیا۔ انگریز کے زمانے میں کالے پانی کے اسیر مولانا جعفر تھانیسری اور ان کے ساتھیوں کو سزائے موت ہوئی تو انگریز گورنر پھانسی کے دن خود یہ نظارا دیکھنے آیا، سزائے موت پانے والوں کا عالم یہ تھا کہ وہ خوشی کے مارے نعرے لگا رہے تھے انگریز حاکم نے حیران ہو کر پوچھا "ابھی تھوڑی دیر میں تو یہ لوگ پھانسی چڑھنے والے ہیں انہیں خوشی کس بات کی ہے؟ جیل کے حکام نے کہا "ان کے مذہب میں یہ موت شہادت ہے، ان کا عقیدہ ہے کہ یہ اس طرح مر کر سیدھے جنت میں جائیں گے اسی لئے خوش ہیں"۔ انگریز کہنے لگا "اگر یہ بات ہے تو میں انہیں خوش نہیں ہونے دوں گا، ان کی سزائے موت سزائے عمر قید میں تبدیل کر دی جائے"۔ شاہ جی نے اپنے انداز خاص میں یہ واقعہ سنایا اور کہا "بر خوردار! اب شعر پڑھو" میں نے شعر پڑھا تو شاہ جی کی اس تشریح کی روشنی میں شعر کا مزا ہی دوبالا ہو گیا تھا۔

جیل سے رہائی ہوئی تو ایک عرصے تک شاہ جی سے ملاقات نہ ہو سکی' ایک مرتبہ لاہور تشریف لائے تو ایک دوست کی معرفت یاد فرمایا' ان دنوں وہ مشہور شیخ حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری رحمتہ اللہ علیہ سے بیعت ہو چکے تھے اور ان کا زیادہ وقت عبادت میں گزرتا تھا' حضرت رائے پوری رحمتہ اللہ علیہ ایمپریس روڈ لاہور کی ایک کوٹھی میں مقیم تھے' شاہ جی نے وہیں طلب فرمایا میں پہنچا تو حضرت رائے پوری مجلس آرا تھے اور بہت سے لوگ باادب ہو کر ان کے ملفوظات سے مستفید ہو رہے تھے' انہی میں شاہ جی بھی تھے میں ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا' میں نے دیکھا جتنی دیر حضرت رائے پوری کی مجلس ارشاد قائم رہی شاہ جی اس ادب و تواضع سے بیٹھے رہے جیسے ان کے سر پر کبوتر بیٹھے ہوں کہ یہ ہٹے تو اڑ جائیں گے۔

دوسری مرتبہ ملتان میں ہوا' میں یہاں ایک اجتماع سے خطاب کرنے گیا تھا۔ پہنچا تو معلوم ہوا شاہ جی بیمار ہیں دوستوں کے ساتھ ان کی عیادت کی غرض سے ان کے آستانے پر حاضری دی مگر یا للعجب یہ کیا ایک کچی بستی میں کچا مکان نہ کوئی نوکر نہ چاکر' پردوں کی جگہ دیواروں پر بوریاں لٹکی ہوئیں' مجھ سے نہ رہا گیا کہا "شاہ جی! آپ یہاں رہتے ہیں؟" کہنے لگے "ہاں یہی محل تو میں نے بندوؤں کے سرمائے سے بنوایا ہے" یہ اس الزام کی طرف اشارہ تھا جو بعض سنگ دل لوگ انہیں کانگریس کا تنخواہ دار کہہ کر لگایا کرتے تھے' طبیعت تڑپ اٹھی میری آنکھوں میں آنسو آ گئے مگر میں نے دیکھا اس بے سروسامانی کے عالم میں بھی شاہ جی کے چہرے پر صبر و شکر کا نور بکھرا ہوا تھا۔ بقول حضرت انجم فوقی بدایونی ؎

اہلِ دل شدّت غم سے کہیں گھبراتے ہیں
اوس پڑتی ہے تو پھول اور نکھر جاتے ہیں

تیسری بار اور آخری بار انہیں مرض الموت میں دیکھا' وہ ماڈل ٹاؤن لاہور میں اپنے عقیدت مندوں کی ایک کوٹھی میں بغرض علاج ٹھہرے ہوئے تھے زبان پر فالج کا اثر تھا، بول نہیں سکتے تھے اللہ اکبر! یہ منظر دیکھنا بھی تقدیر میں لکھا تھا کہ وقت کا سب سے بڑا خطیب اور زبان سے ایک لفظ ادا کرنے میں عاجز و محتاج' شاید قدرت یہ ثابت کرنا چاہتی تھی کہ جس فصاحت و بلاغت پہ حضرت انسان ناز کرتا ہے وہ اس کا کمال نہیں کسی کی عطا ہے جب چاہے جس طوطیٔ خوش نوا کو چاہے منقار زیر پر کر سکتا ہے' انہیں دیکھ کر بے ثباتیٔ عالم کی تصویر نگاہوں میں کھنچ گئی۔ کچھ دیر ان کے سرہانے بیٹھ کر واپس آ گیا۔ دو ہی چار روز کے بعد سنا شاہ جی اللہ کو پیارے ہو گئے۔

وہ حلم اور وہ تواضع اور وہ طرزِ خود فراموشی
خدا بخشے جگرؔ کو لاکھ انسانوں کا انساں تھا